© rasailojaraid.com

جیل سے آغا شورش کے خطوط

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

عبداللہ ملک اپنی کتاب ''شورش بنام عبداللہ ملک'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''شورش کے یہ خطوط جو اس نے ایک زمانہ گزرا، مجھے لکھے تھے۔ ہماری دوستی محبت اور اُلفت کی منہ بولتی داستان ہے۔

محبت ہے راز ، راز کی حد تک ہے سرفراز
جب داستانِ بزم بنی ، خوار ہو گئی!

معلوم نہیں اب جب یہ داستان حوالۂ بزم ہو رہی ہے تو کتنی خوار ہو گی۔ بہر حال اس داستان کی بھی ایک عمر ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ مہینہ یاد نہیں۔ شورش جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ اُس کی رہائی پر مجلسِ احرار نے دہلی دروازہ کے باہر باغ میں جلسہ منعقد کیا تھا۔ مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے شورش کی یہ پہلی تقریر تھی اور مسجد شہید گنج کے ایجی ٹیشن سے مجلس احرار نے اپنا جو اثر ررسوخ کھویا تھا اُس کے عوض میں اُس کو شورش ملا تھا۔ اس لیے مجلس احرار کے زعماء سب کچھ کھو کر بھی اس کامیابی پر بہت نازاں تھے۔ کیونکہ شورش کی صورت میں وہ پوری تحریک شہید گنج کے منفی اور خودغرضانہ کردار پر سے مسلسل پردہ اٹھا رہے تھے۔ اس لیے اس پہلے جلسے کا اہتمام بڑے زور وشور سے کیا گیا تھا۔ اور مجلس احرار کے چوٹی کے رہنما اس میں شریک ہوئے تھے۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''میں سچائی کی دلیل دیتا ہوں۔ یہ چھ فٹ کی دلیل۔ یہی آغا شورش کاشمیری جو کبھی ہمارے خلاف تھے اور آج ہمارے ساتھی بن چکے ہیں۔ یہ ایک پھول تھا جو غیر کے چمن میں تھا جس کے کانٹوں کی چبھن بھی مجھے محسوس ہوئی لیکن میں نے صبر واستقلال کا دامن نہ چھوڑا اور اب یہ پھول میرے دل کے گلدستے کا نمایاں پھول بنا ہوا ہے۔''

آل پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے شورش کاشمیری کی خدمت میں اُس جلسے میں ایک سپاسنامہ پیش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ سپاس نامہ عبداللہ ملک آل پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے پڑھنا تھا اس سے پہلے اُس نے کبھی بھی پبلک جلسے میں تقریر نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ کالج کے مباحثوں میں بھی حصہ نہیں لیا کرتا تھا چہ جائیکہ کسی جلسۂ عام میں سپاس نامہ پیش کرنا۔ بہر حال عبداللہ بٹ نے جو کالج کے مباحثوں کے میدان کے ایک مانے ہوئے شہسوار تھے۔ اُن کی ہمت بندھائی اور دھکیل کر سٹیج پر چڑھا دیا۔ اعلان ہوا اور وہ کاغذ ہاتھ میں تھامے ہوئے لاؤڈ سپیکر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لرزاں وترساں یہ سپاس نامہ پڑھا۔ یہ سپاس نامہ اُس کی اور شورش کی دوستی کی بنیاد بنا۔

آج آغا شورش کاشمیریؒ کی ۳۶ ویں برسی کے موقع پر، دہلی میں، اُن کے ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کے تحریر کردہ اُنھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خطوط کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے جو انھوں نے جیل سے اپنے دوست عبداللہ ملک کے نام ارسال کیے۔

قانونی گرفت تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ مقامی مقدمہ کا فیصلہ اس ماہ کے اختتام پر ہو جائے گا۔ مجھ پر تین مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔ ملتان کے بعد لائلپور میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت میرے جرم و گناہ کی شنوائی ہوگی۔ تیسرا مقدمہ زیر دفعہ ۱۲۹۔الف و ۱۵۳ الف منٹگمری میں سماعت ہوگا۔ کوئی اور مقدمہ ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ البتہ ایک بات ہے اور وہ بھی بہت پرانی۔ شاید مولانا محمد علی مرحوم نے فرمایا تھا اور اب میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب!
بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے

سیاسی اسیر۔ ڈسٹرکٹ جیل ملتان، ۱۰/ اکتوبر ۱۹۳۹ء

”ابھی سماعت مقدمہ شروع نہیں ہوئی۔ شاید دو بجے ہو فیصلہ جو کچھ ہوگا بتا دیں گے۔ یہ پرزہ کاغذ جو ثانی درجہ رکھتا ہے۔ ہتھکڑی لگے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہے، امید ہے قبول خاطر ہوگا۔ اس اختصار کو غنیمت سمجھو باقی ملتان میں۔“

لائل پور۔ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۹ء

”شاید میں نے آپ سے کسی خط میں وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی آپ بیتی کا ایک نا تمام ورق عرض کروں گا۔ لیکن سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ حیران ہوں اپنی کہی ہوئی بات کو کیسے پورا کروں۔ دولت سے میں تہی دامن ہوں کہ کوئی رنگین بات کہوں۔ افلاس کی ہر ادا پھیکی ہوتی ہے۔ علمیّت وہ میرے ہاں کہاں۔ غریب ذہن سے جدّت کا پیدا ہونا پتھریلی زمین سے شاداب ٹہنیوں اور مہک آور پھولوں کی تخلیق کے برابر ہے۔“

ملتان ڈسٹرکٹ جیل۔ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۳۹ء

میری داستان بھی وقت کے ناہموار تھپڑوں کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ زمانہ کی بے دردیوں نے ان اوراق کو سنوارا ہے۔ غمگین لمحوں نے تدوین کی ہے۔ میرے آنسو میرے الفاظ ہیں۔ میری آہیں میرے حروف ہیں۔ عبرت و قنوت میرے مغموم افسانہ کے خاص عنوان ہیں۔ شاید کوئی لفظ تم پر بھی اثر انداز ہو......! طلب بھی ہے اور جستجو بھی۔ تلاش بھی اور تمنّا بھی۔ بے نشانی نشان ہو کر رہ گئی ہے۔ کارواں گزر چکا ہے اب نقشِ کارواں کی تلاش میں ہوں۔ گمشدہ منزل کی جستجو نے دیوانہ کر رکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوں، کون ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں

جبیں پہ گردِ رہِ عشق ، لب پہ مہرِ سکوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیارِ غیر میں پھرتا ہوں ، آشنا کے لیے

بھائی! اس دور کا سب سے بڑا جُرم افلاس ہے۔ گناہ امارت کی آغوش میں نیکی کہلاتا ہے اور نیکی افلاس کے دامن میں گناہ ہو جاتی ہے۔ غریب کی دنیا، حسرتوں کا نشیمن ہے۔ امارت کا ماحول خوشیوں کا سرچشمہ ہے۔ میری مفلسی نے میری بہت سی امنگوں کو جواں ہونے سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ حتّٰی کہ میری کئی تمنّائیں ان کلیوں کی مانند مرجھا گئی ہیں جو پھول بننے سے پہلے سوکھ جایا کرتی ہیں۔ مجھے اُن کی معصوم موت کا افسوس ہے۔ اے کاش

یہ پھول اپنی لطافت کی داد نہ پا سکے کھلے ضرور مگر کِھل کے مسکرا نہ سکے

رات بیت رہی ہے وقت کٹ رہا ہے۔ عمر اپنی آخری منزل کی طرف قدم اٹھائے جا رہی ہے۔ شوق نے بے اختیار کر رکھا ہے۔ میں یہ کیا لکھ رہا ہوں اس کا مجھے بھی علم نہیں ہے۔ جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں سکتا اور جو نہیں کہنا کہے جا رہا ہوں

راہوں سے آشنا ہوں نہ منزل سے روشناس لیے جا رہا ہے شوق چلا جا رہا ہوں میں

اور

کبھی یہاں لیے ہوئے کبھی وہاں لیے ہوئے
پھری ہے تیری جستجو کہاں کہاں لیے ہوئے

امید ہے تم میرے کاسۂ شوق کا احترام کرو گے!

ملتان دسٹرکٹ جیل، ۶ر نومبر ۱۹۳۹ء

سورج کی کرنوں میں سے تاریکی پھوٹ سکتی ہے۔ ستارے اندھیرے کا نشیمن بن سکتے ہیں۔ بادِ خزاں فصلِ گل کہلا سکتی ہے۔ دوزخ کے انگارے جنت کے پھول ہو سکتے ہیں۔ لیکن حریفانِ تاریک خمیر کی نامبارک مساعی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی ہیں۔

غمگین بستی۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۹ء

یہ خط میرے جذبات کا مرقع ہیں، میرے خیالات کی تصویر ہیں، احساسات کا مجموعہ ہیں۔ ان میں میرے جیب و گریباں کی دھجیاں تو نظر آ سکتی ہیں وحشت کا نظارہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن عروسِ شعر کا نظارۂ دلفریب اور شاہد ادب کے حسنِ باصرہ نواز کی جستجو فضول ہے۔ دُکھے ہوئے دل میں لطیف راگ کہاں۔ فغانِ نیم بشی کا گہوارہ شیریں نغموں کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ ذرّوں میں خورشید کی چمک تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن اِن سے تخلیقِ نُور ناممکن ہے۔ ہر خط میرے دیوانہ پن کی علامت ہے، میری وارفتگی کا نمونہ ہے۔ میری پریشانی کی کہانی ہے۔ میری ایذا پسند طبیعت ہمیشہ دشوار پسند رہی ہے جو مزہ تکلیف میں ہے وہ آرام میں نہیں۔ مٹھاس کا حقیقی لطف لینا چاہتے ہو تو کڑوی شے بھی چکھ لو۔ پھولوں کی لطافت سے کھیلنا چاہتے ہو تو کانٹوں کی چبھن سے بھی پیار کرو۔

از: یوسف کدہ، ۱۱ر جنوری ۱۹۴۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مادہ پسند کہتا ہے مذہب نے انسانوں کو تباہ حال کر دیا ہے۔ روحانیت فضول ہے، خدا سب سے بڑا وہم ہے۔ وہ اپنے آپ کو ناقص العقل سمجھتے ہوئے بھی قدرت کاملہ کا انکاری ہے۔ سیدھی سادھی سچائیوں کا حریف ہے۔ مرض کا علاج بتاتا ہے لیکن خود مرض میں مبتلا ہے۔ وہ کہتا ہے مذہب کی تلوار انسانی خون سے کھیلتی رہی ہے لیکن خود یہ سب کچھ کر رہا ہے وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ میں جو الزام مذہب کو دے رہا ہوں وہ اُس سے زیادہ مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ تلوار اگر مذہب کی نیام میں ظلم ہے تو اشتراکیت واشتمالیت کی نیام میں بھی رحمت نہیں ہے۔

منٹگمری جیل، ۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء

دن ہونے میں کچھ دیر باقی ہے۔ ہمارا پہرہ دار ”بول جوان“ کہتے ہوئے گزر جاتا ہے ہر بارک سے ”سب اچھا“ کی آواز آتی ہے۔ محافظ ہر گھنٹہ بعد ”بول جوان“ کی پکار دیتا ہے اور سویا ہوا قیدی ”سب اچھا“ کہتا ہے آنکھ لگتی ہے تو پھر ”بول جوان“ کی آواز آتی ہے۔ میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ جب ہمارا پہرہ دار میری کوٹھڑی پر صدا دیتا ہے تو زبان ”سب اچھا“ کہتی ہے۔ لیکن دل کچھ اور کہتا ہے

دل تھا ترے خیال سے چمن چمن
اب بھی روشن روشن ہے مگر پائمال ہے

منٹگمری، ۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری کا سانحۂ ارتحال

حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے فرزند و جانشین اور ادارہ رحیمیہ لاہور کے بانی حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری ۹ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۲۰۱۲ء بروز بدھ لاہور میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا مرحوم فکری طور پر حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ العزیز اور اُن کی تحریک کے روشن چراغ شیخ الہند مولانا محمود حسن اموی دیوبندی اور امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی سے بے حد متاثر تھے۔ سلوک وتصوف میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری اور اپنے والد ماجد سے فیض پایا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں جمعیت علماء اسلام سے وابستہ رہے اور جمعیت علماء کی ذیلی تنظیم جمعیت طلباء اسلام کے سرپرست تھے۔ جمعیت علماء سے الگ ہوئے تو تنظیم فکر ولی اللّٰہی کی آبیاری کرتے رہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی نسبت سے خانقاہ رحیمیہ قائم کی۔ آہ! بہت خوبیوں والے انسان تھے۔ اب وہ بھی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور حسنات کو قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطاء فرمائے (آمین)

© rasailojaraid.com